بشیر احمد ڈار

مصرِ قدیم کا فلسفۂ اخلاق

(۲)

تیسری نظم کے کچھ حصے درج ذیل ہیں :

آج موت میرے سامنے ہے ___ اس طرح جیسے کہ ایک بیمار آدمی صحت یاب ہو جائے اور بیماری سے اٹھ کر وہ باغ میں ٹہلنے کے لئے نکلے۔

آج موت میرے سامنے ہے ___ لوبان کی خوشبو کی طرح، جیسے کوئی شخص تیز ہوا میں بادبانی کشتی میں سوار دریا کی سیر کر رہا ہو۔

آج موت میرے سامنے ہے ___ کنول کی خوشبو کی طرح، گویا ایک شخص نشہ آور ساحل پر بیٹھا ہو۔

آج موت میرے سامنے ہے ___ ایک تندرو اور تیز ندی کی رفتار کی مانند، اس شخص کی مانند جو بحری جنگی جہاز سے اپنے گھر امن دامان سے واپس آجائے۔

آج موت میرے سامنے ہے ___ اس آدمی کی طرح جس نے اپنی زندگی کے بے شمار سال قید و بند کی مصیبتوں میں بسر کئے ہوں اور اس کے دل میں اپنے گھر پہنچنے کی آرزو ہو۔

اس نظم میں موت کے متعلق وہ خوف و ہراس موجود نہیں جو پہلی نظم اور اس سے پہلے تمہید میں موجود تھا۔ اس جگہ زندگی بعد الموت کا اتنا واضح اور غیر مبہم تصور موجود ہے اور اس پر اتنا اعتماد اور اس کی مقابلۃً اہمیت کو پوری طرح تسلیم کیا گیا ہے۔ جو تشبیہات یہاں استعمال کی گئی ہیں مثلاً بیماری کے بعد صحت، مصیبتوں سے رہائی، جنگ میں قتل ہونے سے بچ کر گھر واپس آنا، قید میں اپنے گھر کی یاد، ان سے صاف مترشح ہوتا ہے کہ اس نظم کے مصنف کے ذہن میں اس موجودہ زندگی اور موت کے بعد کی زندگی کا تصور کس قدر مثبت طور پر عیاں تھا۔ اس میں ایمان بالآخرت کا مظاہرہ ہے چنانچہ چوتھی نظم میں موت کی بجائے بعد الموت کے متعلق واضح بیانات ملتے ہیں۔ موت کے بعد اس زندگی کی طرح دھوکا اور فریب نہیں ہوگا، رشوت یا سفارش سے کام نہیں بن سکے گا بلکہ دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ہو جائے گا۔ موت اب کوئی خوفناک واقع نہیں بلکہ ایک بہتر زندگی کا آغاز ہے جہاں اس دنیا کی ناانصافیوں کی تلافی نہ صرف ممکن بلکہ یقینی ہو گی۔ اس پختہ یقین کے بعد وہ موت کو خوش آمدید کہتا ہے اور حکیم خدا کی عدالت میں حاضر

ہونے کے لئے تیار ہو جاتا ہے۔

یہ شاندار مکالمہ (جو شاید دو ہزار قبل مسیح عالمِ وجود میں آیا) تاریخِ اخلاق میں ایک اپنا مقام رکھتا ہے جس میں آج سے کہیں ہزار سال پہلے انسانوں پر یہ چیز واضح کر دی گئی کہ ہر شخص بلا امتیاز درجہ و رتبہ اپنے اعمال و افعال کا مکمل طور پر ذمہ دار ہے۔ وہ یونہی پیدا نہیں ہوا اور نہ یونہی وہ اس دنیا سے رخصت ہو گا بلکہ موت کے بعد اسے اپنے اعمال کے حسن و قبح کے متعلق خدائے بزرگ و حکیم کے سامنے پوری پوری جواب دہی کرنا ہو گی۔

ایک اور یادداشت ہمارے یہاں "حکیم ایپوور کی ہدایات" کے نام سے محفوظ ہے۔ اس میں اس مصری حکیم نے اپنے زمانے کی سیاسی بدانتظامی، معاشرتی بدحالی اور اخلاقی ابتری کا رونا رویا ہے لیکن ہمارے مقصد کے لئے جو چیز اہم ہے وہ اس تنقید کے بعد ایک شعاعِ اُمید کی طرف راہنمائی ہے۔ بعد کی مذہبی تاریخ میں یہودیوں، زرتشتیوں اور دیگر ادیان میں یہ تصوّر مختلف زمانوں میں سامنے آتا رہا کہ موجودہ بدحالی کو دور کرنے کا ایک طریقہ یہ بھی سمجھا اور پیش کیا جاتا رہا ہے کہ بہت جلد ایک شخص پیدا ہو گا جو انسانوں کو ان کی مصیبتوں سے نجات دلانے کا انتظام کر سکے گا۔ چنانچہ بنی اسرائیل کے انبیاء میں سے یسعیاہ اور حزقی ایل کے ہاں یہ تصوّر بہت نمایاں اور واضح طور پر ملتا ہے۔ بالکل ایسا ہی تصوّر اس مصری حکیم نے بھی پیش کیا ہے جو اسرائیلی نبیوں سے صدیوں پہلے ضبطِ تحریر میں آ چکا ہے۔

متوقع مردِ نجات دہندہ کے متعلق یہ مصری حکیم کہتا ہے: "وہ (معاشرتی بدحالی) کی آگ کو سرد کرے گا اور گرمی کی جگہ ٹھنڈک پہنچائے گا۔ وہ تمام انسانوں کا گلہ بان اور راعی ہے۔ اس کا دل بدی اور شر سے پاک ہے۔ جب اس کا گلہ منتشر ہوتا ہے تو وہ سارا دن ان کو اکٹھا کرنے میں صرف کرتا ہے چونکہ ان کا دل مصائب سے نالاں ہے۔ کاش کہ وہ اس سے پہلے ہی ان بیماریوں کو سمجھ جاتا اور ان کا مداوا کرتا اور بدی کو جڑ سے اکھاڑ پھینکتا۔ وہ ہر ممکن طریقے سے انسانوں کو اس کے شر و فساد سے روکنے کی کامیاب کوشش کرتا ہے ..... وہ آج کہاں ہے؟ کیا وہ شاید سویا ہوا ہے؟ آج اس کی طاقت و جبروت دکھائی نہیں دیتی۔" اسی طرح ایک دوسرا شخص اس نجات دہندہ کے متعلق یوں کہتا ہے: "اس کے زمانے کے لوگ خوشیاں منائیں گے اور انسان کا فرزند اس کا نام ہمیشہ یاد رکھے گا۔ جو لوگ شر اور بدی پھیلانے پر مصر تھے اور بغاوت پھیلانے کا انتظام کر رہے تھے، اُنہوں نے اس کے ڈر سے اپنی زبانیں بند کر لی ہیں ..... تقویٰ، نیکی، عدل واپس آ جائیں گے اور بدی، ظلم اور شر کا ہمیشہ کے لئے خاتمہ کر دیا جائے گا۔ جو دیکھے گا وہ خوش ہو گا۔" متوقع نجات دہندہ کے متعلق ایسے تصورات قدیم سے قوموں میں رہے ہیں اور جب کبھی حالات کی ناسازگاری اپنی انتہا تک پہنچ جاتی ہے تو چند مردانِ حکیم اس قسم کے جذبات کا اظہار کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ اقبال نے اسرارِ خودی میں اس سے ملتے جلتے تصورات کو پیش

کیا ہے:

خیمہ چوں در وسعت عالم زند — ایں بساطِ کہنہ را برہم کند
فطرتش معمور و می خواہد نمود — عالمے دیگر بیارد در وجود
نوعِ انساں را بشیر و ہم نذیر — ہم سپاہی ہم سپہ گر ہم امیر
زندگی بخشد نہ اعجازِ عمل — می کند تجدید اندازِ عمل

اس کے بعد اس مردِ غیب و متوقع کو مخاطب کر کے کہا جاتا ہے:

اے سوار اشہب دوراں بیا — اے فروغ دیدۂ امکاں بیا

اور اس طرف بھی اشارہ کیا گیا ہے کہ موجودہ حالات خراب ترین ہیں اور ان سے نجات صرف اس کے وجود سے ممکن ہے:

باز در عالم بیار ایامِ صلح — جنگ جویاں را بدہ پیغامِ صلح
ریخت از جورِ خزاں برگِ شجر — چوں بہاراں بر ریاضِ ما گزر

بعد کے زمانوں میں مصریوں میں یہ عام رواج تھا کہ میت کو دفن کرتے وقت اس کے صندوق کے سب طرف چند عبارات لکھوا لیتے تھے۔ ان عبارات کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اخلاقی اقدار کو اب دینی بنیاد پر پیش کیا جانے لگا تھا: "تمہارے لئے عدل کرنا ضروری ہے۔ کیونکہ خدائے تعالےٰ عادل و حکیم ہے"۔ "یہ صداقت خود خدائے قادر کے منہ سے نکلی ہے"۔ ایک جگہ ناانصافی اور ناجائز رعایت کے خلاف آواز بلند کرتے ہوئے کہا گیا ہے کہ "خدا جنبہ داری سے نفرت کرتا ہے"۔

ایک قابوتی کتبے کی عبارت خاص طور پر قابلِ ذکر ہے۔ اس میں خود خدا کے الفاظ درج ہیں: "میں نے ہر چار طرف ہوا پھیلا دی ہے تاکہ ہر انسان اپنے بھائی کی طرح اس میں زندگی بھر سانس لے سکے۔ میں نے پانی مہیا کیا ہے تاکہ غریب اور امیر سبھی اس سے اپنی پیاس بجھا سکیں۔ میں نے ہر انسان کو اس کے بھائی کی طرح بنایا ہے اور انہیں بدی کے راستے پر چلنے کی ممانعت کر دی ہے لیکن یہ ان کے اپنے دل ہیں جنہوں نے میرے احکامات کی خلاف ورزی کی"۔ یہ عبارت حضرت عیسےٰ سے تقریباً دو ہزار قبل معرضِ تحریر میں آئی اور اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ کس طرح انسانی اخوت اور برادری کے تصور کو خدا کے عملِ تخلیق سے وابستہ کیا گیا اور اخلاقی لحاظ سے کسی قسم کے امتیازات کو روا نہیں رکھا گیا۔ یہ تحریر مشہور سمیری بادشاہ حمورابی کے زمانے کی ہے اور یہ دیکھ کر تعجب ہوتا ہے کہ جہاں حمورابی کے قوانین تعزیرات میں مراتب و معاشرتی درجات کا لحاظ رکھا گیا ہے وہاں مصری مصلحین نے اسی دور میں ایک بلند ترین تصور پیش کیا جس کے مطابق ہر انسان بہ حیثیت انسان ایک

جیسا ہے اور نیکی اور بدی کا فیصلہ کرتے وقت معاشرتی امتیازات و مراتب کو بالکل نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ تقوے کا دارومدار زیادہ تر داخلی واردات پر منحصر ہوتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ اس دور میں مصری تحریرات میں انسان کے قلب کی اہمیت پر بڑا زور دیا گیا ہے۔ آں حضرت کی ایک مشہور حدیث ہے:

ان فی الجسد مضغۃ اذا صلحت صلح الجسد کلہٗ واذا فسدت فسد الجسد کلہٗ الا وھی القلب۔

انسان کے جسم میں ایک لوتھڑا گوشت ہے کہ اگر وہ ٹھیک ہو تو سارا جسم ٹھیک ہو جاتا ہے اور اگر اس میں فساد آئے تو سارا جسم ہی فاسد ہو جاتا ہے۔ سنو کہ وہ ٹکڑا "دل" ہے۔

قلب کی اہمیت کا اعتراف صوفیاء کے ہاں بھی ملتا ہے اور یہ سب تصورات انسان کی داخلی روحانی زندگی کے تجربات اور واردات کا نتیجہ ہیں۔ "تاہوٹپ کی ہدایات" میں ایک جگہ مذکور ہے: "(نیک مشورے کو) سننے والا خدا کے نزدیک محبوب ہے اور نہ سننے والا معتوب۔ یہ انسان کا دل ہے جو اس کو خدا کا محبوب یا معتوب بناتا ہے۔ انسان کا دل اس کی خوش قسمتی کا ضامن ہے۔" پندرہویں صدی قبل مسیح میں ایک شخص جس نے اپنے وقت کے بادشاہ کی مختلف خدمات سرانجام دی تھیں، ان کو گنوا کر کہتا ہے: "یہ میرا دل تھا جس نے مجھے یہ تمام کام کرنے کی طرف رغبت دی۔ میں نے اس کی ہدایات سے چشم پوشی نہیں کی اور اس کی خلاف ورزی کرتے مجھے ڈر معلوم ہوتا تھا۔ یہ قلب خدا کا سروش غیبی ہے جو ہر شخص کو میسر ہے۔ خوش قسمت ہے وہ شخص جس نے اس کی آواز کو سنا اور اس پر عمل کیا۔" اس طرح مصر میں اخلاق کے معنوں میں گہرائی پیدا ہوتی چلی گئی اور اس کا مطلب اب محض خارجی اور معاشرتی حالات سے میکانکی مطابقت نہ تھا بلکہ اس کے لئے داخلی اور انفرادی معیار قائم ہونے شروع ہوئے اور اسی بنیاد پر بعد میں مصریوں نے توحید اور مابعد الموت کے بلند تصورات پیش کئے۔

"کتاب الموت" ان تحریروں کے مجموعے کا نام ہے جو آج سے ساڑھے تین ہزار سال پہلے معرضِ وجود میں آئی۔ اور جن میں موت کے بعد انسان کا خدا کے حضور میں پیش ہونے اور اس کے اعمال کے تولے جانے کا مفصل ذکر ملتا ہے۔ اس کے متعلق دو یا تین مختلف روایات ہیں۔ پہلی روایت کے مطابق ایک شخص (موت کے بعد) "صداقت کے کمرے" میں داخل ہوتا ہے اور خدا کے چہرے کو دیکھتا ہے۔ وہ کہتا ہے: "اے خدائے مطلق، اے حقیقت مطلقہ میرا سلام قبول کر۔ اے خدا میں تیرے سامنے حاضر ہوا ہوں اور مجھے اس جگہ لایا گیا ہے تاکہ میں تیرا جمال دیکھ سکوں۔ میں تمہارا نام اور ان بیالیس دیوتاؤں[1] کا نام جانتا ہوں جو تیرے ساتھ اس صداقت کے کمرے میں بیٹھے ہیں جو بدکرداروں کا خون

---

[1] بیالیس دیوتاؤں کی تعداد کا تعین مصر کے اُس وقت کے بیالیس صوبوں یا اضلاع کے مطابق تھا۔ ان بیالیس دیوتاؤں کی موجودگی کا مطلب یہ تھا کہ اگر پیش ہونے والا شخص یا صوبے کا دیوتا اس کی تردید یا تصدیق کے لئے موجود ہوگا۔ یعنی بعد میں جو کام فرشتوں کی طرف منسوب کیا جانے لگا وہ مصری "کتاب الموت" میں دیوتاؤں کے سپرد تھا۔

چوس لیتے ہیں۔ میں تیرے پاس آیا ہوں اس حالت میں کہ میرے گناہ مجھ سے زائل ہو چکے ہیں اور میں تقوے تیرے سامنے پیش کرتا ہوں۔ میں نے انسانوں کے خلاف کوئی گناہ نہیں کیا۔ میں نے کوئی وہ عمل نہیں کیا جو خدا کے نزدیک قابلِ نفرت ہو۔ میں نے کسی ملازم کے خلاف آقا کے سامنے چغلی نہیں کھائی۔ میں نے کسی کو بھوکوں مرنے نہیں دیا۔ رونے والوں کے آنسو خشک کئے۔ میں نے کبھی زنا نہیں کیا۔ میں نے اناج کے تولنے میں یا اس کی مقدار میں کبھی کمی نہیں کی۔ میں نے کبھی ترازو کی ڈنڈی نہیں ماری۔۔۔۔۔"

ایک دوسری روایت میں مذکور ہے کہ جب کوئی شخص موت کے بعد حساب و کتاب کے لئے پیش ہوتا ہے تو اس کا دل ایک ترازو میں رکھا جاتا ہے اور دوسرے پلڑے میں ایک پر ڈالا جاتا ہے جو مصری اصطلاح میں "مات" یعنی تقوے، نیکی، صداقت اور عدل کی نشانی ہے۔ اگر اس امتحان میں وہ ناکام ہو جائے تو ایک خوفناک شکل کا شیطان اس وقت اس کو ہضم کر لیتا ہے اور وہ کامیاب ہو جائے تو وہ خدائے تعالےٰ کے حضور میں پیش ہو کر سرخرو ہوتا ہے۔

اخن آتون کا فکری انقلاب

سولہویں صدی قبل مسیح میں مصری سلطنت ایک بیدار مغز بادشاہ کی ہمت سے مصر سے باہر مغربی ایشیا، یونان اور ارد گرد کے تمام ساحلی علاقوں تک پھیل گئی۔ اس سے پہلے یہ تمام ملک تجارتی لین دین کے سلسلے میں ایک دوسرے سے منسلک تھے، مختلف لوگ اِدھر سے اُدھر اور اُدھر سے اِدھر آتے جاتے رہتے تھے لیکن اس دَور میں ان میں سیاسی وحدت بھی پیدا ہو گئی جس کے باعث لوگوں کے تصورات میں ایک نیا انقلاب پیدا ہونا شروع ہوا۔ مذہب اور اخلاق کے معاملہ میں یہ تبدیلی بڑی اہم ثابت ہوئی۔ خدا کی توحید اور اس کا رب العالمین ہونے کا تصوّر اگرچہ مصر میں شروع سے ملتا ہے لیکن اس سیاسی انقلاب اور وسعت کے ساتھ اس تصوّر میں بھی وسعت و وضاحت پیدا ہونی شروع ہوئی۔ اہرامی کتبات میں خدا کے لئے "لامحدود" کی صفت اکثر استعمال کی جاتی رہی اور اسی طرح ٹاہوٹپ کے ہاں ایک عالمگیر اخلاقی اقتدار کا نقشہ ملتا ہے جہاں خدائے شمس کو ربِ کائنات اور مالک و خالق کُل کا لقب دیا گیا ہے لیکن عام طور پر تحریروں میں اس شمس دیوتا کو مصری فرعون کی شکل میں پیش کیا جاتا رہا جس کی حکومت اور اقتدار مصر کی حدود سے باہر نہیں تھیں۔ لیکن جب اس دَور میں فکری انقلاب پیدا ہوا تو یہ خدائے شمس ہی تھا جو تمام کائنات کا رب اور سب انسانوں کا خالق قرار دیا گیا جس کی آنکھ ہر ساعت ساری زمین کو دیکھتی ہے۔

اس خاندان کا ایک نامور حکمران آمون ہوٹپ سوم (تقریباً ۱۴۰۰ قبل مسیح) ہو گزرا ہے۔ اس کے زمانے

لہ آمون ہوتپ۔ آمون ایک مصری دیوتا کا نام تھا۔ "آمون ہوتپ" کے لغوی معنی ہوئے "آمون مطمئن ہوا"۔

کی یادگار "خدائے شمس کی مناجات" کے مطالعے سے اس اہم تبدیلی کا پتہ چلتا ہے:

"تم نے سب چیزوں کو بنایا حالانکہ خود تم کو بنانے والا کوئی نہیں.... تمہاری صفات بے مثال ہیں، تم ازل سے ہو اور ابد تک رہو گے اور تمام لوگ تمہاری ہدایت اور راہنمائی کے محتاج ہیں.... جب تم آسمان پر سے گزرتے ہو تو تمام لوگ تمہیں دیکھتے ہیں اگرچہ تمہارا چلنا لوگوں کی آنکھوں سے پوشیدہ ہے..... تم سب کے خالق اور سب کے رب اور پروردگار ہو.... تم دیوتاؤں اور انسانوں کے لئے بطور ایک ماں کے ہو، ایک بہادر گلہ بان کی طرح جو اپنے مویشیوں کا رکھوالا ہے، تم ہی ان کی پناہ اور ان کے رزق دینے والے ہو.... وہ تمام کائنات جس کی تخلیق اس کے ہاتھوں ہوئی ہر لمحہ دیکھتا رہتا ہے۔ وہ اکیلا اور واحد خدا ہے جس کے قبضہ میں تمام ملک ہیں، وہ آسمان پر درخشاں ہے اُس طرح جس طرح سورج۔ وہ مہینوں کے حساب سے موسم پیدا کرتا ہے، گرمی اور سردی جب اس کا دل چاہے....."

اس مناجات سے صاف عیاں ہے کہ ان کے ہاں خدا کا تصوّر بالکل توحیدی مذاہب کے مماثل موجود ہے، جو تمام انسانوں کا خالق و رب ہے اور جو محض ان سے ماورا ہی نہیں بلکہ ان کے دکھ سکھ کو محسوس کرنے والا اور ان کا ہمدرد و نگہبان بھی ہے۔

اس کے بعد اس کا بیٹا آمون ہوٹپ چہارم ۱۳۷۵ قبل مسیح میں تخت نشین ہوا اور اس کے زمانے میں اس فکری انقلاب کی رفتار اور زیادہ تیز ہو گئی۔ اس کا پہلا اثر قدیم مذہبی جماعتوں پر ہوا جنہوں نے محسوس کیا کہ اگر یہ انقلاب کامیاب ہو گیا تو ان کا اقتدار ہمیشہ کے لئے ختم ہو جائے گا۔ چنانچہ انہوں نے اس تحریک کو ختم کرنے کے لئے پورا زور لگایا اور شاید یہ انہی لوگوں کی ریشہ دوانیوں کا نتیجہ تھا کہ سلطنت کے بیرونی علاقوں میں مختلف عناصر بادشاہ کے خلاف اُٹھ کھڑے ہوئے۔ لیکن ان تمام ناسازگار حالات کے باوجود بادشاہ نے اپنی نئی تحریک پروان چڑھانے کے لئے عزم بلند کا ثبوت دیا اور ہر قسم کے دنیاوی اور مادی فوائد کی بالکل پروا نہ کی۔ قدیم عقائد میں توحید کے باوجود کچھ کچھ مشرکانہ تصوّرات موجود تھے اس لئے اس نے خدائے شمس کے پرانے نام "آمون" کی بجائے خدائے واحد کے لئے ایک نیا لفظ تجویز کیا "آتون" جو قدیم زبان میں آسمانی سورج کے لئے مستعمل تھا۔ اس نے نام کی تبدیلی کے ساتھ ہی قدیم نشان بھی بدل ڈالا۔ پہلے "اہرام" اور "باز" کی شکل خدائے شمس کا نشان تھا۔ یہ گویا مصری قومی نشان تھا لیکن اب جبکہ خدائی تصوّر میں وسعت پیدا ہو چکی تھی اور وہ رب العالمین قرار پا چکا تھا تو ایسا نشان جو صرف مصر کی تاریخی اور جغرافیائی حدود سے متعلق ہو اس کے لئے مناسب نہ تھا۔ چنانچہ اب سورج کو بطور ایک چکر کے پیش کیا جانے لگا جس سے بے شمار شعاعیں نیچے کی طرف نمودار ہو رہی ہیں اور ہر شعاع ایک انسانی ہاتھ میں ختم ہوتی ہے۔ اس نشان کا مفہوم واضح تھا کہ ایک مرکزی طاقت عالمِ بالا سے اس عالم ارضی پر حکمرانی کرتی ہے اور تمام

مخلوق اس کے دستِ قدرت وشفقت سے پرورش پا رہی ہے[1]۔ اس کے بعد اس نے اپنا نام بھی بدل ڈالا۔ "آمون ہوٹپ" کی بجائے اب وہ "اخن آتون" (یعنی آتون مطمئن ہے) ہوگیا اور آمون دیوتا کا نام ہر پرانے کتبے سے محو کر دیا گیا۔ اس کے علاوہ جہاں کہیں خدا کے لئے جمع کے الفاظ استعمال کئے گئے تھے جس سے دیوتاؤں کی کثرت یا شرک کا شائبہ ہوتا تھا وہ سب اسی طرح قدیم کتبات وتحریروں سے مٹا دئے گئے۔

اس نئے مذہب کے اختیار کرنے میں اخن آتون کے پاس کئی وجوہات تھیں سب سے اہم تو یہ ہے کہ اس نے اپنے ذاتی واردات اور تجربے یا دوسرے الفاظ میں الہام ووحی کی بنا پر منتخب کیا تھا جس پامردی اور عزم کا ثبوت اس کی زندگی میں ملتا ہے اور خاص کر جس ہمت ودلیری سے اس نے تمام مخالفتوں اور دشمنوں کی فتنہ انگیزیوں کا مقابلہ کیا اور سب مادی فوائد کو نظر انداز کر دیا اس سے یہی اندازہ ہوتا ہے کہ اس تحریک کا آغاز مکمل یقین وایمان سے ہوا۔ دوسری وجہ اخن آتون کی بیوی (نوفری تیتی) تھی۔ فراعین مصر کا قدیم سے دستور رہا تھا کہ وہ اپنی بہن سے شادی کرتے تھے لیکن اخن آتون نے اس رسم کو ختم کرنا چاہا اور ایک غیر ملکی عورت سے شادی کی۔ یہ ملکہ شام کی رہنے والی تھی جہاں خدائے شمس کی ہی پرستش ہوتی تھی۔ خوش قسمتی سے یہ عورت نہ صرف ظاہری خوبصورتی سے آراستہ تھی بلکہ غیر معمولی صلاحیت اور ذہنی اور فکری بلندی کی مالک تھی۔

آمون دیوتا کی پرستش اور اس کے ساتھ وابستہ پروہتوں اور مذہبی گروہوں کی مخالفت کی ایک واضح وجہ یہ بھی تھی کہ انہوں نے مندروں میں دیوداسیوں کا گروہ جمع کر رکھا تھا اور اس طرح مذہب کی آڑ میں زنا اور دیگر برائیوں کی پرورش ہو رہی تھی۔ بدقسمتی سے یہ رسم اس قدیم زمانے میں تقریباً ہر جگہ موجود تھی اور معلوم ہوتا ہے کہ اخن آتون نے اپنی بیوی کے زیر اثر اس کو اور اس کے ساتھ آمون دیوتا کی پرستش کے طریقے کو ختم کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ نئے دین کا خدا "آتون" بھی ایک قسم کا شمس دیوتا ہی تھا لیکن اس میں اور قدیم پرستش میں چند نمایاں فرق تھے۔

---

[1] خدا کو سورج سے متعلق کرنے کا تصور اگرچہ مصری تھا اور اس سے ایک قسم کے شرک کی بُو بھی آتی تھی، تاہم بعد میں جب یہ تصور یہودیوں کے ہاں پہنچا تو انہوں نے اس کو بطور تشبیہ اختیار کیا اور اس تشبیہ میں سورج کی شعاعوں اور کرنوں کے الفاظ بھی شامل کر لئے گئے۔ مثلاً عہد نامہ قدیم کی کتاب ملاکی کے یہ الفاظ قابلِ توجہ ہیں: "لیکن تم پر جو میرے نام کی تعظیم کرتے ہو آفتابِ صداقت طلوع ہوگا اور اس کی کرنوں میں شفا ہوگی" (باب ۴۔ سورت ۲) اسیطرح مصری تصاویر اور کتبات میں خدا کو باز اور اس کے پھیلائے ہوئے پروں کی شکل میں پیش کیا جاتا رہا تھا چنانچہ خدا کے ساتھ پروں کے سائے کا تصور اس طرح وابستہ ہوگیا کہ بعد میں یہودیوں میں خدا کو باز کی شکل میں پیش کرنے کا تصور تو غائب ہوگیا لیکن پروں کے سایہ کی تشبیہ قائم رہی۔ چنانچہ زبور میں چار مختلف جگہوں پر یہ تشبیہ خدا کے ساتھ استعمال کی گئی ہے: (۱) مجھے اپنے پروں کے سایہ میں چھپا لے (۱۷، ۸) (۲) (اے خداوند!) بنی آدم تیرے بازوؤں کے سایہ میں پناہ لیتے ہیں (۳۶، ۷) (۳) تیرے پروں کے سایہ میں پناہ لونگا (۵۷، ۱) (۴) اور میں تیرے پروں کے سایہ میں خوشی مناؤں گا (۶۳، ۷)

خیال ہوتا ہے کہ مصر کے اس فکری انقلاب کا اصلی اور بنیادی سبب شاید حضرت ابراہیم کی تعلیم و تبلیغ ہو جو اخن آتون سے تقریباً ۵۰۰ سال پہلے مغربی ایشیا میں توحید خداوندی کا واضح اعلان کر چکے تھے۔ بتوں کی پوجا کی ممانعت، مندروں اور عبادت گاہوں کا ترک صرف اس لئے کہ ان میں بتوں کی پوجا ہوتی تھی اور عورتوں کی بے حرمتی اور زنا کے اڈے بن چکے تھے اور اس کے ساتھ ساتھ توحید خداوندی کا پُرجوش اعلان سبھی باتیں حضرت ابراہیم کے تصورات کی آواز بازگشت معلوم ہوتی ہیں۔

مصر کے اس ذہنی اور فکری انقلاب کے دور کی بہت سی تحریریں ہمارے پاس خوش قسمتی سے محفوظ ہیں جن سے اس تبدیلی کی وسعت کا اندازہ ہوتا ہے۔ ان میں سے بہت سی نظمیں خود اخن آتون کی ہیں جن میں بعض جگہ زبور کے تصورات والفاظ سے بہت زیادہ مماثلت پائی جاتی ہے۔ اگر یہ نظریہ تسلیم کر لیا جائے کہ مصر کا یہ دینی انقلاب حضرت ابراہیم کی تعلیم کا نتیجہ تھا تو یہ مماثلت چنداں تعجب انگیز نہیں پہلی نظم خدا (آتون) کی عالمگیر عظمت و طاقت کے متعلق ہے:

"اے زندہ آتون تم ہی سے زندگی کا آغاز ہوا جب تم مشرق سے نکلتے ہو تو اس کائنات کا ہر چپہ تمہارے جمال سے منور ہو جاتا ہے۔ تم جمیل، عظیم، منور ہو اور ہر ملک تمہارے زیر نگیں ہے۔ اگرچہ تم ہم سے بہت دور ہو لیکن تمہاری شعاعیں اور تمہارا نور اس زمین پر موجود ہے۔ اگرچہ تم انسانوں کے چہرہ میں موجود ہو تاہم تمہارے قدم دکھائی نہیں دیتے" یہ آخری فقرہ انجیل کے مشہور الفاظ کی یاد دلاتا ہے کہ خدا نے انسان کو اپنی شکل پر پیدا کیا۔

"تیری صنعتیں کیسی بے شمار ہیں! وہ لوگوں سے پوشیدہ ہیں۔ اے خدائے واحد جس کے علاوہ اور کوئی خدا نہیں، تو نے اس زمین کو اپنے دل (یعنی حکمت) کے مطابق پیدا کیا۔[1]

"ایک وقت تھا کہ تم اکیلے تھے آدمی اور مختلف قسم کے مویشی جو اس زمین پر پاؤں سے چلتے ہیں اور تمام پرندے جو آسمان کی فضا میں اڑتے ہیں، تمام ملک، شام، کش اور مصر، تم ہی ہر انسان کو اس کی مناسب جگہ پر پیدا کرتے اور ان کی ضروریات کو مہیا کرتے ہو۔ ہر آدمی کا رزق اور اس کی عمر کا تعین تمہاری ہی طرف سے ہوتا ہے۔ لوگوں کی زبانیں ان کی شکلیں اور ان کے رنگ ایک دوسرے سے مختلف ہیں اور یہ سبھی تیری تخلیق کا نمونہ ہیں۔"

"کوئی شخص سوائے تمہارے بیٹے اخن آتون کے تمہیں نہیں جانتا۔ تم نے اسے اپنی حکمت کی باتوں سے خبردار کیا، اور اسے عزت اور طاقت بخشی۔"

---

[1] زبور باب ۱۰۴ سورہ ۲۴ کے الفاظ اور ان دونوں کی مماثلت قابل غور ہے:

اے خداوند! تیری صنعتیں کیسی بے شمار ہیں! تو نے یہ سب کچھ حکمت سے بنایا۔ زمین تیری مخلوقات سے معمور ہے۔"
(کتاب مقدس، برٹش اینڈ فارن بائیبل سوسائٹی لاہور ۱۹۳۱)

ان تمام مختلف مناجاتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ اخن آتون نے کائنات کے ہر ذرے میں خدائے واحد کا جلوہ دیکھا ہے اور اس نے کوشش کی کہ یہ علم و یقین تمام لوگوں کے سامنے پیش کیا جائے۔ یہ ارض و سما، جانور اور پرندے، انسان اور حیوان، درخت اور پانی سبھی گویا اس کی حمد و تعریف میں رطب اللسان ہیں، وہ اپنی سب مخلوق کے لئے ماں اور باپ کی طرح ہے وہی ان کو پیدا کرتا، ان کو رزق دیتا، ان کو ہدایت دیتا ہے۔ اس کا جمال ہر جگہ نمایاں ہے۔

"تم نے یہ آسمان بنایا تاکہ تم اس پر طلوع ہو سکو اور اس مخلوق کو دیکھ سکو جس کو تم نے پیدا کیا اس وقت جب تم تنہا تھے ..... تمام آنکھیں تمہیں اپنے سامنے دیکھ سکتی ہیں۔ جب تم غروب ہو جاتے ہو، تو اگرچہ دنیا کی آنکھیں تمہیں نہیں دیکھ پاتیں تاہم تم میرے دل میں موجود ہوتے ہو۔"

لیکن بدقسمتی سے یہ انقلاب مصر کی سرزمین میں مستقل طور پر اپنے قدم نہ جما سکا اور بہت جلدی مختلف اطراف سے اس کے خلاف بغاوتیں پیدا ہونی شروع ہوئیں اور چند ہی سالوں میں رجعت پسندوں نے اخن آتون اور اس کے ساتھیوں کا خاتمہ کر دیا اور اس نئے توحیدی دین کی بجائے وہی قدیم آمون دیوتا کی پرستش پھر سے رائج کر دی گئی۔ اس کے باوجود اس نئے دور میں بھی اگرچہ شرک اور کثرت پرستی کی پوری پوری سرپرستی کی گئی تاہم بہت سے ترقی پذیر تصورات جن کی آبیاری اخن آتون نے اپنے خون سے کی تھی بار آور ہوئے اور آہستہ آہستہ یہ خیالات مصر سے باہر دوسرے ملکوں تک پہنچ گئے۔

اس آخری دور (یعنی ... اقبل مسیح) کی ایک اہم یادداشت "حکمت آمون موپ" خوش قسمتی سے ہمارے پاس محفوظ ہے۔ اس تحریر کی اہمیت اس لحاظ سے بھی بہت زیادہ ہے کہ اس کے تصورات حتیٰ کہ الفاظ تک بائیبل کی کتاب امثال (باب ۲۲) میں بکثرت ملتے ہیں۔ تاریخی طور پر یہ بات پایۂ ثبوت تک پہنچ چکی ہے کہ "حکمت آمون موپ" کا یہودی زبان میں ترجمہ ہوا تھا اور دوسری مصری تحریروں کے ساتھ یہ بنی اسرائیل کے ہاتھوں میں پہنچ چکی تھی۔

یہاں حکمت آمون موپ کے صرف وہ اقتباسات پیش کئے جاتے ہیں جن سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ کس حد تک عہد عتیق کی مختلف کتابوں کے مصنفین نے اس کتاب کے تصورات اور الفاظ سے استفادہ کیا ہے:

آمون موپ	یرمیاہ
خود سر اور مغرور آدمی جو مندر میں آتا ہے وہ اس درخت کی طرح ہے جو بیابان میں اُگا ہوا ہے۔ ایک ساعت میں اس کی شاخیں گر پڑتی ہیں اور آخر کار اس کی لکڑی آرے کی نذر ہو جاتی ہے۔ وہ اپنی جگہ سے دریا کی مدد سے کسی اور جگہ پہنچا دیا جاتا ہے اور اس کا مدفن آگ ہوگا۔	خداوند یوں فرماتا ہے کہ ملعون ہے وہ آدمی جو انسان پر توکل کرتا ہے اور بشر کو اپنا بازو جانتا ہے اور جس کا دل خداوند سے برگشتہ ہو جاتا ہے۔ کیونکہ وہ زقمہ کی مانند ہوگا جو بیابان میں ہے اور کبھی بھلائی نہ دیکھے گا بلکہ بیابان کی بے آب جگہوں میں اور غیر آباد

ایک دانا اور سمجھدار انسان جو فخر و غرور سے عاری ہے اس درخت کی مانند ہے جو باغ میں کھڑا ہو، وہ پھلتا ہے اور پھلوں کی کثرت سے شاداب ہے۔ وہ اپنے خداوند کے حضور میں قائم و دائم ہے۔ اس کا پھل میٹھا اور اس کا سایہ پسندیدہ اور اس کا انجام جنت (یعنی باغ) ہے۔

زمین شور میں رہے گا۔ مبارک ہے وہ آدمی جو خداوند پر توکل کرتا ہے اور جس کی اُمید گاہ خداوند ہے کیونکہ وہ اس درخت کی مانند ہوگا جو پانی کے پاس لگایا جائے اور اپنی جڑ دریا کی طرف پھیلائے اور جب گرمی آئے تو اسے کچھ خطرہ نہ ہو بلکہ اس کے پتّے ہرے رہیں اور خشک سالی کا اسے کچھ خوف نہ ہو اور پھل لانے سے باز نہ رہے۔ (باب ۱۷۔۵۔۸)

آمون موپ نے دو مختلف اخلاقی اصولوں کی تشریح کے لئے دو درختوں کی مثال دی ہے۔ اور اسی طرح کی مثال یرمیاہ میں بھی موجود ہے۔ زبور کی پہلی کتاب میں تقریباً یہی تشبیہ استعمال ہے۔

"مبارک ہے وہ آدمی جو شریروں کی صلاح پر نہیں چلتا اور خطاکاروں کی راہ میں کھڑا نہیں ہوتا..... وہ اس درخت کی مانند ہوگا جو پانی کی ندیوں کے پاس لگایا گیا ہے جو اپنے وقت پر چلتا ہے اور جس کا پتہ بھی نہیں مرجھاتا..... شریر ایسے نہیں بلکہ وہ بھوسے کی مانند ہیں جسے ہوا اُڑا لے جاتی ہے اس لئے شریر عدالت میں قائم نہ رہیں گے....."[1] (باب ۱، ۱۔۵)

یہی تصوّر قرآن مجید میں بھی اسی مثال کے ساتھ پیش کیا گیا ہے:

الم تر کیف ضرب اللہ مثلاً کلمۃ طیبۃً کشجرۃ طیبۃ اصلھا ثابتٌ وّ فرعھا فی السماء۔ توتی اُکلھا کلّ حین باذن ربھا ویضرب اللہ الامثال للناس لعلھم یتذکرون ومثلُ کلمۃ خبیثۃ کشجرۃ خبیثۃ اجتثت من فوق الارض مالھا من قرار۔

(۱۴: ۲۴-۲۶)

کیا آپ کو معلوم نہیں کہ اللہ تعالےٰ نے کیسی مثال بیان کی ہے کلمۂ طیبہ کی کہ وہ ایک پاکیزہ درخت کے مشابہ ہے جس کی جڑ خوب گڑی ہو اور اس کی شاخیں اونچائی میں جا رہی ہوں۔ وہ خدا کے حکم سے ہر فصل میں اپنا پھل دیتا ہے اور اللہ تعالےٰ ایسی مثالیں لوگوں کے واسطے اس لئے بیان کرتا ہے تاکہ وہ خوب سمجھ لیں اور گندہ کلمہ کی مثال ایسی ہے جیسے ایک خراب درخت ہو کہ زمین کے اوپر ہی اوپر سے اکھاڑ لیا جائے اور اس کو کچھ ثبات نہ ہو۔

اسی طرح کتاب امثال میں ایک جگہ (۲۲، ۱۷) مذکور ہے کہ "اپنا کان جھکا اور داناؤں کی باتیں سن" اور دوسری جگہ (۲۴، ۲۳) لکھا ہے کہ "یہ بھی داناؤں کے اقوال ہیں"۔ بائیبل کے ناقدین کے لئے یہ فیصلہ کرنا بڑا مشکل تھا کہ یہ دانا کون ہیں لیکن جب سے "حکمت آمون موپ" دستیاب ہوئی ہے اب سب محققین اس پر متفق ہو چکے ہیں کہ کتاب امثال کا

---

[1] یہ بات قابلِ غور ہے کہ زبور کی ساری کتاب میں "خدائی عدالت" کا تصوّر اس ایک جگہ کے علاوہ کسی اور جگہ نہیں ملتا اور یہ چیز تو اب تسلیم شدہ ہے کہ موت کے بعد عدالت کا تصور یہودیوں نے مصر سے ہی لیا۔

تقریباً ڈیڑھ باب کم از کم اسی مصری کتاب کے لفظی ترجمہ پر مشتمل ہے اور جس کو اس کتاب کے مصنف نے "داناؤں کے اقوال" کے نام سے ذکر بھی کیا ہے۔ مثال کے طور پر چند اقتباسات درج ذیل ہیں:

امثال	آمون موپ
اپنا کان جھکا اور داناؤں کی باتیں سن اور میری تعلیم پر دل لگا۔	اپنا کان جھکا اور جو میں کہتا ہوں سن اور ان کو سمجھنے کے لئے دل لگا۔
کیونکہ یہ پسندیدہ ہے کہ تو ان کو اپنے دل میں رکھے اور وہ تیرے لبوں پر قائم رہیں۔ (۲۲-۱۷-۱۸)	کیونکہ یہ فائدہ مند ہے کہ تو ان کو اپنے دل میں رکھے لیکن افسوس ہے اس پر جو ان کی خلاف ورزی کرتا ہے۔
کیا میں نے تیرے لئے مشورت اور علم کی تیس باتیں نہیں لکھی ہیں؟ ...... (۲۲-۲۰)	ان تیس بابوں پر غور کرو کیونکہ ان میں ہدایت اور اطمینان ہے۔

اس طرح کے بے شمار تقابلی اقتباسات محققین نے پیش کئے ہیں جن سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ کس طرح مصری افکار یہودیوں کے ہاں پہنچ کر عیسائی اور اسلامی فکر کا جزو بنے۔ انسان کی قدیم فکری تاریخ کو ہم مختصراً تین دوروں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ پہلا دور جس میں مصر اور بابل کے مفکرین نے انسان اور کائنات کے مسائل کو سوچا اور اپنا اپنا حل پیش کیا۔ یہ دور تقریباً ۱۰۰۰ قبل مسیح تک آکر ختم ہو جاتا ہے۔ اس دور میں زرتشت نے آکر انسانی افکار کو وسیع اور گہرا کیا۔ دوسرا دور اندازاً ۶۰۰ قبل مسیح تک ہے جس میں بنی اسرائیل دنیا کی متمدن قوموں کی امامت پر سرفراز ہے اور اسی شاندار دور میں چین میں کونفیوشس اور ہندوستان میں گوتم بدھ پیدا ہوئے۔ اس کے بعد تیسرا دور ۶۰۰ قبل مسیح سے شروع ہوتا ہے جب مغربی ایشیا میں یونیوں نے ان انسانی افکار کے سلسلے کو اپنایا اور آگے بڑھایا۔

سرسیّد کے مذہبی افکار (انگریزی)

مصنّفہ بشیر احمد ڈار

ہندوستان میں تحریک اصلاح کے علمبردار سید احمد خاں کے افکار کی تشریح و توضیح۔ قیمت دس روپے۔

ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ۔ کلب روڈ۔ لاہور